بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

فلسفۂ مذہب میں یہ بحث ہمیشہ اہلِ فکر کی توجہ کی مرکز رہی ہے کہ کیا مذہب کا تعلق انسان کے لطیف جذبات و احساسات سے ہے یا ٹھوس تعقّلات سے؟ آپ مذہب کی پُوری تاریخ کا اگر مطالعہ کریں تو آپ کو ہر مقام اور ہر منزل پر انسان کو ان دو بنیادی سوالات میں اُلجھا ہوُا پائیں گے۔ لیکن اگر اس مسئلے کو ذرا دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بحث بذاتِ خود مذہب کے صحیح ادراک کی کمی اور انسان کے بارے میں صحیح فہم و شعور کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ مذہب کا تعلّق انسان کے جذبہ و احساس سے بھی ہے، اس کے تعقّل سے بھی، اور اس کے عمل سے بھی۔ بلکہ ان سب سے بڑھ کر اس کا تعلق اُس اساسی تصوّر سے ہے جس کے مطابق وہ اس کائنات میں اپنا مرتبہ و مقام اور مقصدِ حیات متعیّن کرتا اور پھر اس مقصد کی تکمیل کے لیے سوچنے کا ایک خاص انداز اور عمل کا ایک خاص نہج اختیار کرتا ہے۔ یہ اساسی تصور، جسے مذہب کی زبان میں عقیدہ کہا جاتا ہے، وہ سرچشمہ ہے جس سے فکر و عمل اور جذبہ و احساس کے دھارے پھوٹتے ہیں۔ جب انسان کی پُوری زندگی افکار و احساسات اور عملی سرگرمیوں سے عبارت ہے تو لامحالہ وہ ضابطۂ ہدایت بھی جسے ان سارے میدانوں میں رہنمائی کا فرض سرانجام دینا ہے، حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں پر پُوری طرح مُحیط ہوگا۔ چنانچہ ایک صحیح مذہب کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ انسان کے عقیدے، اس کے غور و فکر کے انداز، اس کے احساسات و جذبات، اور زندگی کے مختلف دائروں میں اُس کے افعال و اعمال کو سلامتی کی راہ پر لگائے۔

انسان کے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور اس کے لیے ایک ہی ضابطۂ حیات درکار ہے جو فکر و عمل کا ایک جامع لائحہ عمل ہو تو پھر وہ کونسے اسباب ہیں جنہوں نے حیاتِ انسانی کی وحدت کو اور اس کے لائحہ عمل کی جامعیت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم

کر دیا؟ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ اس معاملے میں بھی شیطان نے اپنے مخصوص انداز کے مطابق یہ سارا فتنہ و فساد برپا کیا ہے، یعنی اس نے روحانی زندگی کے تقدس کے نام پر یہ سارا شرمناک کھیل کھیلا ہے۔

اگر آپ انسان کے اندر مذہبی احساس کو ٹٹولنے کی کوشش کریں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس عالم مجاز سے ارفع و اعلیٰ ایک غیر مرئی اور روحانی عالم کے وجود کا احساس درحقیقت مذہب کی جان ہے جس طرح انسان اپنے فطری داعیات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح وہ اپنے مذہبی احساسات سے بھی بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ کوئی انسان خواہ کافر ہو یا مومن، بت پرست ہو یا مظاہر پرست، اُسے اس احساس سے کبھی مفر نہیں۔ یہ احساس اُس کے قلب و دماغ میں طرح طرح کے سوالات پیدا کر کے اُسے عالم حقیقت کے صحیح ادراک کا خواہشمند بناتا ہے۔ وہ اُسے یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کائنات کا آغاز و انجام کیا ہے؟ اس کی زندگی کا مبداء اور منتہا کیا ہے؟ کیا اس آب و گِل کی محسوس اور محدود دنیا سے ماوراء کوئی اَن دیکھی حقیقت بھی موجود ہے؟ اس حقیقت کا اس عالمِ محسوس سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ کارخانہ قدرت خودبخود معرضِ وجود میں آگیا ہے اور اپنے بل بوتے پر چل رہا ہے؟ یا یہ کسی عظیم مدبر کی تدبیر اور صنعت کاری کا نتیجہ ہے اور وہی اُسے اپنی حکمتِ بالغہ کے ساتھ چلا رہا ہے؟

انسان کے اِن فطری سوالات کا جواب دو طریقوں سے دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک گروہ نے اپنے نفس کی گہرائیوں میں حقیقتِ کبریٰ کا ادراک کر کے یہ کہا کہ جس عالمِ روحانی کا احساس انسان کے دل میں موجود ہو اُس کے لیے دلائل و شواہد پیش کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔ انسان اپنے من میں ڈوب کر حقیقتِ کبریٰ کو اچھی طرح جان سکتا ہے۔ مگر انسان کی وسیع برادری میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دل کی آنکھوں سے اس حقیقتِ کبریٰ کا مشاہدہ کرنے کے بجائے فطرت کے حسن و جمال کو دیکھ کر اُس کے وجود کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ان لوگوں کو پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی، سورج کی خشمگیں کرنیں، چاندنی کی ٹھنڈک، صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت ایک صانع کے وجود کا پتہ دیتی ہے اور وہ عقلی تجربے اور مشاہدے کے ذریعے خالقِ کائنات کا ادراک کرتے ہیں پہلے گروہ کا اگر مشاہدۂ باطن رہنما ہے تو دوسرے کا عقل اور تجربہ و مشاہدہ۔

خالقِ حقیقی کا ادراک اور اُس سے تعلق چونکہ ایک رُوحانی کیفیت کا نام ہے اس لیے پہلے گروہ نے یہ سمجھا کہ مذہبی زندگی گزارنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ محسوس اور مادّی چیزوں سے یکسر دامن بچا کر صرف مراقبہ اور گیان دھیان کے ذریعہ مشاہدۂ حق کیا جائے۔ ان لوگوں کے نزدیک مذہب کا تعلق انسان کے لطیف جذبات و احساسات سے ہے، اور جو چیزیں یا داعیات ان میں حائل ہوتے ہیں وہ مادی آلائشیں ہیں جن سے ایک مذہبی آدمی کو پاک ہونا چاہیے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیک اور خدا پرست لوگ تو دیدارِ الٰہی میں منہمک ہو گئے اور دنیا کے سارے معاملات حرص و ہوا کے بندوں کے ہاتھ میں منتقل ہونے لگے اور انہوں نے انسانیت کو اپنی ہوس کاریوں اور ستمرانیوں کا تختۂ مشق بنانا شروع کیا۔ جب بگڑے ہوئے لوگ قوت و طاقت کے مالک بن جائیں اور معاشرے کے خدا ترس اور با اخلاق افراد اُمورِ دنیا سے یکسر بے تعلق ہو جائیں تو پھر ظلم و استبداد کی راہ کون روک سکتا ہے۔ چنانچہ اس صورتِ حال سے بدقماش لوگوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

یہ تو تھے وہ معاشرتی اور خارجی حالات جو مذہب کو صرف جذبہ و احساس تک محدود رکھنے سے پیدا ہوئے۔ مگر یہ طرزِ فکر انسان کو باطنی طور پر بھی مکمل سکون اور اطمینان سے ہمکنار نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حاسّۂ مذہبی کوئی ایک جذبہ نہیں بلکہ وجدان ہے اور مختلف جذبات سے مرکب ہے۔ یہ ایک مجموعی ذہنی کیفیت یا رجحانِ نفس کا نام ہے جس کے ماتحت مختلف اوقات میں مختلف جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ جذبات نوعیت کے اعتبار سے اتنے متعدد اور گوناگوں ہیں کہ انسان کے لیے یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کونسا صحیح رُوحانی جذبہ ہے اور کونسا دینی انا کا بگڑا ہوا عکس۔ چنانچہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے کے لیے وہ کسی ایسے معیار کا محتاج ہے جو اس سلسلے میں اُسے ہدایت اور رہنمائی دے۔ اب اس معیار سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے عقل کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کی عقل کسی چیز کے صحیح ہونے پر شہادت نہیں دیتی اس وقت تک اس کو مکمل اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ چنانچہ دیکھیے کہ آسمانی اور الہامی ادب میں بھی انسانی جذبات کو اپیل کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی فکر و شعور کو بیدار کرنے اور آنکھیں کھول کر نظامِ کائنات کو دیکھنے کی بھی بار بار دعوت دی گئی ہے۔ یہ انسان کی اس فطری طلب ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے دینی ادب میں علمِ کلام کو ہمیشہ ایک اونچا مقام حاصل رہا ہے۔

ایک طرف اہلِ دل صوفیاء نے مشاہدۂ باطن کے ذریعے انسان کے قلب کو منور کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف اہلِ بصیرت نے عقلی استدلال کی مدد سے انسان کے ذہنی اضطراب کو دُور کیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو عقل اور جذبہ کی دوئی کو مٹا کر انسانی زندگی کی فطری وحدت کو برقرار رکھنا اور اس کی فطرت کے دونوں مطالبوں کو پورا کرنا ہی دینِ حق کی سب سے بڑی خدمت اور کامیابی ہے اور اس معاملے میں اسلام کا کردار دوسرے سارے ادیان سے ممتاز ہے۔

اُس نے سب سے پہلے انسان کے دل میں اس خیال کو راسخ کیا کہ انسان ہی قادرِ مطلق کی صنّاعی کا ایک نمونہ نہیں ہے بلکہ یہ ساری کائنات اس کی تخلیق و تدبیر کا نتیجہ ہے، اس وجہ سے یہاں کی ہر چیز نہایت گہری روحانیت کی حامل ہے بشرطیکہ اسے مذہب کے پاکیزہ احساسات کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ فکر و نظر کا یہ ایک عظیم انقلاب ہے جو اسلام نے برپا کیا ہے۔ مذہب کے اندر گہری بصیرت رکھنے والے حکماء نے جنت سے آدم کے نکلنے کی جو توجیہ کی ہے وہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو اُس کی لغزش معاف کر دینے کے باوجود زمین پر اس لیے رکھا کہ وہ محض روحانی کیف و مستی کو ہی اپنا منتہائے مقصود نہ بنائے بلکہ روحانی رفعت و بلندی کے حصول میں اُن مادی علائق اور دنیوی تعلقات میں بھی تقدیس پیدا کرے جو اپنی فطرت کے اعتبار سے تو مقدس ہی ہیں مگر انسان کی حد سے بڑھی ہوئی مادیت اور محسوس پرستی انہیں روحانی کیف سے محروم کر دیتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یُوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو روحانی سربلندی کے لیے جد و جہد کرتے وقت صرف اپنی رُوح ہی کو لے کر آگے نہ بڑھنا ہو گا بلکہ اس کے ساتھ اُن سارے مادّی رشتوں کو بھی پاکیزہ اور مقدس بنانا ہو گا جن میں وہ جکڑا ہُوا ہے۔ جس طرح جسمانی پاکیزگی کا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ آدمی ناپاک کپڑوں کو اُتار کر بالکل برہنہ ہو جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جسم کے ساتھ کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت کا بھی التزام کرے، بالکل اسی طرح تزکیۂ نفس اور روح کی بالیدگی کا مطلب بھی یہ نہیں کہ باری تعالیٰ نے مادّی تعلقات اور حسّی خواہشات اور تمناؤں کا جو لباس انسان کو عطا کر رکھا ہے اُسے تار تار کر دے یا اُس کے تقاضوں سے یکسر غافل ہو جائے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کے

اس قیمتی عطیّے کی بھی قدر کرے اور اُسے رُوح کی طرح ہی پاک اور صاف رکھے۔ مادی علائق کو توڑ کر اور دنیا اور اُس کی ترغیبات سے منہ موڑ کر رُوح کی تسکین اسلام میں قطعاً مطلوب و مقصود نہیں۔ کیونکہ یہ باری تعالیٰ کے عطیات کی ناشکری ہے۔ انسان کی حقیقی عظمت اور خدا کے ہاں اُس کی سرخروئی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ روح کی پاکیزگی کے ساتھ زندگی کے دوسروں شعبوں کو بھی پاکیزہ بنائے۔ اُس کے صنفی تعلقات میں پاکیزگی ہو۔ اُس کے کاروباری معاملات میں باری تعالیٰ کی محبت جلوہ گر ہو۔ اس کی سیاست اور معاشرت خداخوفی کی عملی تفسیر ہو۔ اور اس طرح اس کی زندگی کا ہر شعبہ تجلیاتِ الٰہی کا مظہر ہو۔ مادّی زندگی کی خواہشات اور ترغیبات کو بالکل ختم کر کے ذاتِ حق کا احساس یقیناً ایک مجاہدہ ہے مگر اس سے بڑا مجاہدہ یہ ہے کہ نفس کی تحریصات کے ہوتے ہوئے انسان حق و صداقت کے راستے پر گامزن رہے۔ آپ زندگی میں اُس انسان کو کبھی قدر کی نگاہ سے نہ دیکھیں گے جو کسی خطرے کو دیکھ کر اکیلا اپنی جان کی حفاظت کے لیے بھاگ اٹھتا ہے، بلکہ اُس شخص کی تعظیم اور اُس کی خدمات کا اعتراف اور اُس کی انسانیت دوستی اور جذبۂ رحم کی قدر کریں گے جو اپنے ساتھ دوسرے بے سہارا لوگوں کی جان کی محافظت کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور اس راہ میں جان کی بازی تک لگا دیتا ہے۔

اسلام نے انسان کی پُوری زندگی کو اُس کے سارے متقضیات کے ساتھ رُوحانی کیف اور تعلق باللہ کی جیتی جاگتی تصویر بنانے کی جو کوشش کی ہے اس کا اندازہ اس کی تعلیمات سے کیا جا سکتا ہے۔ آپ پیدائش اور موت کو ہی دیکھیں۔ پیدائش کے وقت نومولود کے کان میں اذان اور اقامت کہی جاتی ہے، یعنی اُس کے قلب و دماغ کی پاکیزہ لوح پر سب سے پہلے یہ نقش ثبت کیا جاتا ہے کہ تجھے یہ پُوری زندگی اُسی طرح توجہ الی اللہ کے ساتھ گزارنی ہے جس طرح ایک نمازی اذان اور اقامت کے بعد خدا کے حضور میں کھڑا ہو کر پُوری یکسوئی کے ساتھ تکبیر کا انتظار کرتا ہے۔ پھر موت کے وقت نمازِ جنازہ میں نہ تو اذان کہی جاتی ہے اور نہ اقامت۔ اس کا غالباً مطلب یہ ہے کہ خدا کے حضور میں تمہاری حاضری کے لیے جو اذان اور اقامت تمہاری پیدائش کے وقت کہی گئی تھی اب تکبیر کے ساتھ تمہاری اس عبادت کی تکمیل ہو رہی ہے۔ یعنی تمہاری پُوری زندگی بارگاہ الٰہی میں

حاضر ہونے کی بس تیاری ہی ہونی چاہیے۔ اور تمہاری حیاتِ مُستعار کے سارے لمحات اس احساسِ ذمہ داری اور اس محبت اور خوف کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ صرف ہونے چاہییں جس طرح خدا کا ایک نیک بندہ نماز سے پہلے چند ثانیے صرف کرتا ہے۔ نماز کیا ہے؟ باری تعالیٰ کے دربار میں حاضری۔ موت بھی درحقیقت اسی حاضری کا نام ہے۔ اور یہ زندگی اُس حاضری سے پہلے کا وقفہ ہے جسے انسان کو اُسی احساس کے ساتھ گزارنا چاہیے جس کے ساتھ وہ اقامت اور تکبیر کے درمیان کے وقفے کو گزارتا ہے۔

اسلام نے رُوح کو پاکیزہ بنانے کے ساتھ ساتھ جسمانی تقاضوں کو بھی پاکیزہ بنانے پر جو زور دیا ہے وہ اسلام کے بنیادی رکن یعنی نماز سے پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام کے معترضین نے دینِ حق کے خلاف جس قدر اعتراضات کیے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اسلام کی سب سے بڑی عبادت یعنی نماز میں انسانی رُوح کو باری تعالیٰ میں جذب ہونے کا موقع نہیں ملتا اور رکوع و سجود اس کی یکسوئی میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ مگر یہ ان معترضین کی ناسمجھی ہے۔ اسلام کا تو یہ منشا ہی نہیں ہے کہ انسان دنیا سے یکسر بے تعلق ہو کر اپنے آپ کو باری تعالیٰ کے وجود میں اس طرح گم کر دے جس طرح کہ قطرہ دریا میں کھو کر اپنا وجود ختم کر دیتا ہے۔ اسلام انسان کو عبودیت کے مقام پر رکھنا چاہتا ہے نہ کہ معبود میں جذب کر دینا۔ اسی وجہ سے وہ عابد و معبود کے امتیاز کو کسی صورت بھی مٹنے نہیں دیتا۔ اُس نے اس امر کا پُورا التزام کیا ہے کہ عین عبادت کے وقت جب انسان باری تعالیٰ کی طرف پُوری طرح متوجہ ہوتا ہے وہ کہیں جذب کی حالت میں اپنے مرتبہ و مقام کو فراموش نہ کر دے۔ اس لیے اُس نے اُس کے شعُور کو بیدار رکھنے کا یہ انتظام کیا ہے کہ اپنے آپ کو یکسر محو کرنے کے بجائے کھڑا ہو کر پُورے فہم کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرے، پُورے ضابطے کے تحت رکوع و سجود کر کے اللہ کی تسبیح کرے، اور ایک مخصوص طریقے کی پابندی کرتے ہوئے نماز کو اختتام تک پہنچائے۔ نماز میں یہ مختلف جسمانی حرکات اور حالتیں، اور پھر ان میں مختلف کلمات ادا کرنا انسانی شعُور کی بیداری اور خارجی دنیا سے تعلق قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اسلامی تعلیمات کے رمز شناس ائمہ نے تو اس بات کو بھی پسند نہیں کیا کہ کوئی شخص آنکھیں بند کر کے نماز ادا کرے۔ کیونکہ اس سے بعض اوقات

انسان پر غفلت طاری ہو جانے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔
جذب کی ایسی کیفیت جس سے انسان اپنے آپ کو بھول جائے، اپنی ذمہ داریوں کو بھول جائے اور اپنے خالق اور مالک کے مرتبہ و مقام اور اُس کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو بھول جائے، اسلامی تعلیمات کی عین ضد ہے۔

اسلام میں روحانی کیف کا بھی ایک مقام ہے، لیکن یہ وہ روحانی کیف ہے جو روح کو مادّی تعلقات سے آزاد کر کے یا اُن سے غافل ہو کر پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان تعلقات کی ساری ذمہ داریوں سے احکام الٰہی کے مطابق عہدہ برا ہو کر معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اسلام نے روحانی لذت کو انسان کا منتہائے مقصود قرار نہیں دیا بلکہ بندگیٔ رب کو اس کی غایت الغایات ٹھیرایا ہے۔ اسلام ایک احساسِ فرض کا نام ہے جو باری تعالیٰ کے تعلق کی وجہ سے انسان کے دل میں اپنے متعلق، اپنے ابنائے جنس کے متعلق، اور کائنات کے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ جب تک ان سارے تعلقات کو خالقِ کائنات کے تعلق کے تابع رکھ کر پوری طرح نبھایا نہیں جاتا اسلام کا منشا پورا نہیں ہوتا۔ اسلام خدا کے ساتھ تعلق کی خاطر دوسرے تعلقات کو توڑ دینے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ انہیں ہدایتِ الٰہی کے مطابق درست اور اُستوار کر کے انہیں مقدس بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ آپ اوقاتِ نماز کے نظام پر غور کریں تو آپ کو اسلام کا مزاج بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ باری تعالیٰ اگر چاہتا تو یہ بھی کر سکتا تھا کہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کرنے کے بجائے ایک ہی سکون کے وقت میں ادا کرنے کا حکم صادر فرما دیتا۔ مگر اُس نے انہیں دن کے مختلف اوقات میں پھیلا دیا ہے تاکہ انسان امورِ دنیا میں کھو کر خدا کو نہ بھول جائے اور خدا کے حضور میں بار بار اپنی بندگی کا اعتراف کر کے اور اس کے ساتھ پیمانِ عبودیّت باندھ کر دنیا کے بندے کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے بندے کی حیثیت سے امورِ دنیا سرانجام دے تاکہ امورِ دنیا اور آخرت میں بُعد و بیگانگی کے بجائے یکسانیت و وحدت پیدا ہو جائے۔ پھر آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ جن اوقات میں انسان کے خدا سے غافل ہونے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں ان نمازوں کی رکعتوں کی تعداد کم مگر ان کا اجر بہت زیادہ رکھا گیا ہے۔ مثلاً نماز عصر۔ یہ کاروبار کے انتہائی عروج کا وقت ہوتا ہے، اس بنا پر انسان کا اس کاروبار میں انہماک بالکل فطری امر ہے۔

چنانچہ اس وقت نماز کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ اجر کی بشارت دی گئی ہے۔ مگر انسانی مزاج کا خیال رکھتے ہوئے اس کی رکعتیں کم مقرر کی گئی ہیں یہی حال نماز فجر کا ہے۔ یہ ہر روز خدا کی بندگی اور عبودیت کا سب سے پہلا اظہار اور اس کی راہ میں نفس کے ساتھ جہاد کا اوّلین مظاہرہ ہے۔ اگر عصر کے وقت انسان دنیاوی کاموں میں کھویا ہوتا ہے تو فجر کے وقت جسم کے تقاضے اُس پر غالب ہوتے ہیں۔ مگر بندۂ مومن ان تقاضوں سے مغلوب ہونے کے بجائے ان پر غالب آکر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا ثواب بھی نسبتًا زیادہ ہے۔

امُورِ دنیا کو چھوڑ کر بار بار دربارِ الٰہی میں کھنچے چلے آنا اور جسمانی لذّت اور آرام کو ترک کر کے مالک الملک کے حضور میں حاضری دینا اور پھر حاضری کے بعد امُورِ دنیا اور آرام و آسائش کی طرف متوجہ ہونا اگر ایک بہت بڑی آزمائش ہے تو انسان کی اخلاقی اور روحانی عظمت اور سربلندی کا سب سے مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ امُورِ دنیا اور وہ جسمانی لذت و آرام جو حیاتِ انسانی کے خالص مادّی شعبے ہیں، انہیں بھی اسلام تعلق باللہ کے نُور سے منوّر کر دیتا ہے۔ یہ ایک عظیم مجاہدہ ہے۔ قرآن مجید نے اسی مجاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۂ جمعہ میں فرمایا ہے:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا	پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل
فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ	جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد
اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (رکوع ۲)	یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

یہ آیت امُورِ دین اور امُورِ دنیا کے باہمی تعلق کے سلسلے میں بڑی فکر انگیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے حضور میں حاضری کے بعد عملی جد و جہد کے لیے دنیا میں پھیل جاؤ مگر اس جد و جہد کی غرض و غایت بھی بجز فضلِ الٰہی کے حصول کے اور کوئی نہ ہونی چاہیے۔ یعنی زندگی کے سامان کی تلاش کرتے ہوئے بھی یہ مادّی سامان قطعًا تمہارا مقصود نہ بننا چاہیے، بلکہ اس میں بھی تمہارے پیشِ نظر باری تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا ہی ہونی چاہیے اور تمہیں یہ کام خدا سے غافل ہو کر نہیں بلکہ اُس معبودِ حقیقی کو زیادہ سے زیادہ یاد کر کے سرانجام دینا چاہیے۔ تاکہ یہ دوڑ دھوپ تمہاری روحانی ترقی کا ذریعہ بنے۔

اس آیت کے بالکل متصل ہی قرآن مجید نے انسانی کمزوری کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا

اور جب انہوں نے کوئی سودا بکتے دیکھا یا کوئی تماشہ ہوتے دیکھا تو اس کی طرف دوڑ گئے اور اے نبی، تم کو کھڑا چھوڑ دیا

یعنی خدا سے غفلت، اور حُبِّ دنیا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دنیوی منفعتوں اور لذتوں کی طرف کھچ کر چلا جاتا ہے اور اس کی زندگی میں یہ توازن باقی نہیں رہتا کہ وہ دین اور دنیا کے تقاضے پورے کرنے میں اعتدال قائم کرے۔

مسلمان اگر دنیا کی طرف متوجہ بھی ہوتا ہے تو اس کی محبت میں گرفتار ہو کر نہیں بلکہ اپنی بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ دنیا کے یہ وسائل قادرِ مطلق کے عطیات ہیں جنہیں ایک بندۂ مومن اُس کی ہدایت کے مطابق استعمال کر کے اپنی بندگی اور اُس محسنِ مطلق کے حضور میں احسانمندی کا عملی ثبوت پیش کرتا ہے۔

اسلام نے حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں کو کس قدر پاکیزہ اور روحانیت سے لبریز کیا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے حضور سرورِ کائنات ؐ سے جو دعائیں منقول ہیں اُن پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ ایک عام انسان زندگی کے جن شعبوں کو خالص حیوانی شعبے سمجھتا رہا ہے انہیں اس صادق و مصدوق ؐ کی تعلیمات نے کس طرح روحانیت کے نور سے منور کر دیا ہے۔ جنسی خواہش سے زیادہ کونسی دوسری خواہش اور اس تعلق سے زیادہ کونسا دوسرا تعلق حیوانی ہو سکتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب میاں بیوی مادی زندگی کی اس لذت سے لطف اندوز ہونے کا ارادہ کریں یا لطف اندوز ہو رہے ہوں تو اس وقت بھی ایک دعا کے ذریعہ شیطان کے خطرات سے محفوظ رہنے اور باری تعالیٰ کے وجود کا احساس کرنے اور اس کی پناہ ڈھونڈنے کی تلقین کی گئی ہے۔